POSTED AT NDPSO ON 17-18 AUGUST 2000
U (C) 160/2000 TO POST WITHOUT PREPYAMENT
POSTAL REGN. NO. DL-11186/2000 R.NO.2186/57

HAMARI ZABAN (WEEKLY) | ہفت روزہ

ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

۲۲ تا ۳۱ اگست ۲۰۰۰ء (22-31 August 2000)
شمارہ نمبر: ۳۲ جلد نمبر: ۵۹

کوکن میں اردو کی ایک گمنام خدمت گزار

سردار محمدی بیگم [عطیہ بیگم فیضی و زہرا بیگم فیضی کی رفیق]

پروفیسر عبدالستار دلوی (سابق کرشن چندر پروفیسر و صدر شعبۂ اردو ممبئی یونیورسٹی)

انیسویں صدی میں جہاں لڑکوں کی تعلیم کے لیے منصوبے بنے وہیں خواتین کی تعلیم اور ترقی کے لیے بھی کوششیں ہوئیں۔ شمالی ہندوستان میں اردو کے حوالے سے ذہن سازی کا کام ڈپٹی نذیر احمد، مولانا الطاف حسین حالی اور محمد حسین آزاد نے کیا۔ ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے ناول توبۃ النصوح، بنات نعش، مراۃ العروس اور رویائے صادقہ لکھے۔ ان کا مقصد مسلم سماج میں خواتین کی ذہنی تربیت کرنا تھا۔ انھیں شدت سے یہ احساس تھا کہ زندگی کی گاڑی کو چلانے کے لیے مردوں کے ساتھ عورتوں میں تعلیم بھی ضروری ہے۔ چنانچہ تعلیم نسواں کی کسی تحریک کی غیر موجودگی میں انھوں نے انفرادی سطح پر اپنے اس مقصد اور کار خیر کے لیے ان ناولوں کا سہارا لیا۔ ان ناولوں کے اردو معاشرے پر دور رس اثرات مرتب ہوئے۔ اسی زمانے میں مولانا الطاف حسین حالی نے بھی اس اہم ضرورت کو محسوس کیا۔ مولانا حالی اس زمانے میں خالص سماجی اور معاشرتی لحاظ سے شدت احساس کے شاعر تھے۔ چپ کی داد، تعلیم نسواں، مناجات بیوہ اور اسی طرح کی دوسری نظمیں حالی کے سماجی شعور کی آئینہ دار ہیں۔ انھوں نے بھی ایک مختصر قصہ "مجالس النسا" لکھا، جس میں قصہ کہانی کے روپ میں لڑکیوں میں تعلیم کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ محمد حسین آزاد کی "نصیحت کا کرن پھول" بھی تعلیم نسواں کے مقصد کے تحت لکھی گئی۔ سر سید احمد خاں اس زمانے میں اردو معاشرے میں تعلیم، سماجی اصلاح اور معاشرتی و سیاسی اعتبار سے ایک دیو پیکر شخصیت تھی۔ مسلم معاشرے پر ان کے احسانات کی طویل فہرست ہے مگر تعلیم نسواں کے تعلق سے ان کے افکار مردوں کی تعلیم کے مقابلے میں مختلف تھے۔ البتہ جدید طرز پر تعلیم نسواں کے تعلق سے علی گڑھ ہی میں شیخ عبداللہ نے گرلس کالج قائم کر کے ایک اہم ضرورت کو پورا کیا۔ علی گڑھ گرلس کالج کے ذریعے لڑکیوں نے اعلا تعلیم میں پیش قدمی کی اور تعلیم تہذیب نسواں نے ایک تحریک کی صورت اختیار کی۔ اس سلسلے میں عورتوں میں تعلیم کے فروغ اور سماجی و علمی و معاشرتی زندگی میں ترقی کے لیے مولوی ممتاز علی نے "تہذیب نسواں" کے نام سے خواتین کا ایک رسالہ شائع کیا۔ "تہذیب نسواں" کی اشاعت سے اردو معاشرے میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔ لاہور، دہلی، حیدر آباد، بمبئی اور اسی طرح دور دور کے مقامات "تہذیب نسواں" کے دائرۂ اثر میں آئے اور ہندوستان کے طول و عرض سے خواتین نے اس رسالے میں مختلف سماجی، تعلیمی اور معاشرتی موضوعات پر مضامین لکھنے شروع کیے اور اس طرح یہ رسالہ اردو گھرانوں میں ایک مقبول رسالہ بنا جس نے خواتین کے ذہنوں کی تربیت کی اور اردو ادب میں خواتین نے اپنی یادگار تحریریں چھوڑیں۔ محمدی بیگم مولوی ممتاز علی کی دست راست تھیں۔ نذر سجاد حیدر، یلدرم، مسز حمایوں مرزا، عطیہ بیگم فیضی، زہرہ بیگم فیضی اور متعدد دیگر خواتین نے "تہذیب نسواں" میں مضامین لکھنے شروع کیے۔ خاتون اور عصمت کا شمار بھی قدر اول کے خواتین کے رسالوں میں ہوتا ہے، لیکن "تہذیب نسواں" کا حلقۂ اثر دوسرے رسالوں کے مقابلے میں وسیع تر تھا۔ "تہذیب نسواں" کے زیر اثر ملک کے طول و عرض میں تہذیب نسواں کے مقاصد کے فروغ کے لیے "انجمن تہذیب نسواں" کے نام سے خواتین کی انجمنیں قائم ہوئیں۔ اس طرح کی انجمنیں بمبئی اور کوکن کے علاقے میں مان گاؤں (ضلع قلابہ، اب رائے گڑھ) کے قریب لونی گاؤں میں بھی قائم کی گئیں۔ اسی طرح خواتین کی دیگر انجمنیں بھی قائم کی گئیں۔ "انجمن خواتین بمبئی" اس سلسلے کی ایک اہم انجمن تھی۔

کوکن کے علاقے میں بہمنی دور ہی سے اردو کا رشتہ قائم ہے۔ کوکن کے علاقے احمد نگر کی نظام شاہی اور بیجاپور کی عادل شاہی کے زیر نگیں رہے ہیں۔ یہاں اگرچہ گھریلو زبان کوکنی رہی مگر دکنی اردو سے بھی ان کا رشتہ قائم رہا۔ اسکولوں میں یہ مراٹھی کے ساتھ اردو کی تعلیم بھی حاصل کرتے رہے۔ کوکنی اگرچہ گھریلو اور عام بول چال کی زبان رہی ہے تاہم اردو ایک تہذیبی اور مذہبی زبان کی حیثیت سے فروغ پاتی رہی۔ رتنا گری، قلابہ اور تھانے میں اردو زبان و ادب کا عام رواج تھا۔ ۱۸۳۰ء میں محمد ابراہیم [illegible] کے لکھے گئے تعلیم نامے، اردو کی اولین نصابی کتابیں تھیں جو بقول کار ساں دتاسی مدراس، لاہور اور پشاور تک درسی کتابوں کی حیثیت سے رائج تھیں۔ مدرسوں میں خواتین بھی اردو زبان کا خصوصی درس لیتی تھیں، اردو ان کی تہذیبی اور مذہبی شناخت کے لیے ضروری تھی۔ شادی بیاہ کے گیت اور جھولے کے گیت، کوکنی گھرانوں میں مقبول تھے۔ مگر کوکن کی اولین خاتون جس نے اردو زبان میں اپنی شعری تخلیقات یادگار چھوڑی ہیں، حمیدہ دار کر ہیں۔ انھوں نے نہ صرف کوکنی زبان میں جو فارسی عربی رسم الخط میں لکھی جاتی تھی، سماجی برائیوں پر حمیدہ مجلس یا نصیحت النسا مثنوی لکھی بلکہ اردو میں بھی چند نظمیں یادگار چھوڑی ہیں۔

حمیدہ دار کر کے بعد اردو زبان و ادب سے گہری دل چسپی لینے کا سہرا محترمہ سردار محمدی بیگم کے سر ہے۔ سردار محمدی بیگم کوکن کے ضلع قلابہ (اب رائے گڑھ) میں موضع مان گاؤں کے قریب لونی میں قیام پذیر تھیں۔ انھیں اردو زبان و ادب سے گہری دل چسپی تھی اور ان کا تعلق ریاست دالی سے تھا۔ وہ تحریک تعلیم نسواں سے بہت متاثر تھیں اور مولوی ممتاز علی سے محمدی بیگم نہ صرف قریب تھیں بلکہ وہ خواتین کے مشہور رسالہ "تہذیب نسواں" میں باقاعدگی سے مضامین بھی لکھا کرتی تھیں۔ ان کے متعدد مضامین تہذیب نسواں میں شائع ہوئے ہیں۔ یہ مضامین ۱۹۱۳ء تا ۱۹۳۵ء کو محیط ہیں۔ ان کے چند مضامین جو "تہذیب نسواں" میں شائع ہوئے، حسب ذیل ہیں: سر کے بال (۱۹۱۳ء)، سلامتی بہار کا مہینہ (۱۹۱۳ء)، غسل کے چند اصول (۱۹۱۳ء)، شہر پونہ کی تاریخ (۱۹۱۳ء) وغیرہ۔ چھوٹے چھوٹے معلوماتی مضامین تہذیب نسواں کی خصوصیت تھی۔ اس کا مقصد اردو داں خواتین کو روز مرہ کی ضروریات

اور ابھی ساقی زندگی گزارنے کے لیے مفید مضامین کے ذریعے ممو آگہی عطا کرتا تھا۔ سردار محمدی بیگم کے مضامین بھی اسی نوعیت کے ہوا کرتے تھے۔ اس حلقے میں بنت نذر الباقر جو بعد میں نذر سجاد حیدر بنیں، ابتدائی عہد بیسویں صدی کی ممتاز ترین خاتون تھیں جن کی ممتاز ترین بیٹی قرۃالعین حیدر صاحبہ ہیں جو اردو کی خواتین ادیبوں ہی میں نہیں بلکہ مجموعی طور پر اردو ادب میں بحیثیت افسانہ نگار، ناول نگار اور دانشور کے ممتاز درجے پر فائز ہیں۔

سردار محمدی بیگم مضامین کے علاوہ مقامی خبروں سے بھی "تہذیب نسواں" کو باخبر رکھتی تھیں۔ ان کے بمبئی کی دو ممتاز خواتین عطیہ بیگم فیضی اور زہرہ بیگم فیضی سے بھی مراسم تھے۔ دسمبر ۱۹۱۲ء میں جب عطیہ بیگم فیضی کی شادی مسٹر رحیم بیمولیل (بعد میں فیضی رحمین) سے ہوئی تو اس کی اطلاع بھی "تہذیب نسواں" میں سردار محمدی بیگم ہی کے ذریعے شائع ہوئی۔ اسی طرح اس عقد کی تفصیلات اور مسٹر رحیم بیمولیل کے اسلامی نام اور ان کے مشرف بہ اسلام ہونے اور شادی کی دیگر تفصیلات بھی سردار محمدی بیگم کے حوالے سے سند کا درجہ حاصل کرتی ہیں اور ایک اہم دستاویز کا درجہ رکھتی ہیں۔

"تہذیب نسواں" میں "محفل تہذیب" کے تحت مختلف علاقوں میں قائم "بزم تہذیب نسواں" کی رپورٹیں شائع ہوتی تھیں۔ مولوی ممتاز علی کے انتقال پر "انجمن خواتین بمبئی" کے تحت ایک تعزیتی جلسہ منعقد ہوا جس کی روداد "تہذیب نسواں" میں شائع ہوئی۔ اس جلسے میں زہرہ بیگم فیضی نے "ممتاز زمن" کے نام سے ایک تعزیتی مضمون "تہذیب نسواں" ۹ جولائی ۱۹۳۵ء کو لکھا جس میں اس خاندان سے اپنے دیرینہ تعلقات اور تہذیب نسواں اور محمدی بیگم کی خدمات کا ذکر ہے۔ زہرہ بیگم فیضی سے ان کے تعلقات ۱۹۰۹ء سے تھے۔ وہ جب ان سے ملنے لاہور گئیں تو ان کا لاہور میں قیام محمدی بیگم ہی کے یہاں تھا۔ ۱۳ جولائی ۱۹۳۵ء کو "انجمن خواتین بمبئی" نے ایک تعزیتی جلسہ کیا جس کا ریزولیشن مسز سلطانہ آصف فیضی نے پیش کیا اور مختصراً مولانا ممتاز علی کے حالات زندگی بیان کیے اور انھیں خراج عقیدت پیش کیا۔ اس قسم کے حالات واقعات سے "تہذیب نسواں" کے صفحات بھرے ہوئے ہیں جن میں سردار محمدی بیگم پیش پیش رہتی تھیں۔

لونی (ضلع قلابہ) میں سردار محمدی بیگم نے "تہذیب نسواں" کی تحریک کو فروغ دینے کی خاطر "انجمن تہذیب نسواں" بھی قائم کی تھی۔ وہی اس انجمن کی صدر بھی تھیں۔ اس انجمن کے ماہانہ جلسے ہوا کرتے تھے اور ان جلسوں کی مدد سے اس علاقے کی خواتین کی تعلیمی اور سماجی و مذہبی اصلاح کی جاتی تھی۔ اس کا ایک جلسہ ۱۳ اگست ۱۹۳۵ء کو منعقد ہوا تھا۔ اس انجمن کے اغراض و مقاصد حسب ذیل تھے:

۱- پہلا مقصد ترجمہ کے ساتھ کلام پاک اور احادیث کی اشاعت تھا۔
۲- دوسرا مقصد قرون اولیٰ کی خواتین کا نیک نمونہ پیش کرنا۔
۳- تیسرا مقصد مذہبی اور اخلاقی تعلیم۔
۴- چوتھا مقصد پرورش و تربیت اولاد کے اصول۔
۵- حفظانِ صحت کے طریقے۔
۶- اصلاح رسم و رواج اور خانہ داری۔
۷- بجائے کوکنی کے اردو کی ترویج و اشاعت۔
۸- کوئی تقریر کی باب۔

اس جلسے میں مذکورہ مقاصد کے تحت احادیث، اولاد کی تعلیم و تربیت، ہمت و استقلال کے موضوعات کے تحت مضامین پڑھے۔ کوکن میں جیسا کہ اس سے قبل ذکر ہو چکا ہے، مسلمانوں کی گھریلو زبان کوکنی ہے۔ کوکنی مراٹھی کی ایک ذیلی بولی کی حیثیت رکھتی ہے لیکن مسلمانوں کی کوکنی پر عربی و فارسی کے اثرات زیادہ ہیں اور اس لحاظ سے یہ دیگر کوکنی کی بولیوں سے مختلف ہے، تہذیبی و مذہبی لحاظ سے اردو (دکنی لہجے میں) عام طور سے بولی اور سمجھی جاتی ہے جسے ہندستانی کہا جاتا ہے۔ مذکورہ جلسے کا ایک اہم مقصد یہ تھا کہ اہل کوکن میں کوکنی کی بجائے اردو کو رواج دینا۔ چنانچہ تفضیل النسا بیگم نے اس جلسے میں "زبان اردو کی خوبیاں بیان کر کے اسے یہاں ملک کوکن میں عام طور پر رواج دینے کی ضرورت پر ممبران کو متوجہ کیا کیوں کہ یہ ملک کوکن ہونے کی وجہ سے یہاں کی عام زبان کوکنی ہے"۔

سردار محمدی بیگم کا اصل نام عظمت النسا تھا۔ وہ مہاراشٹر میں وائی کے نواب کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ ان کی شادی غلام محمد بن شہاب الدین قاضی جلبانی ساکن لونی کے ساتھ ہوئی۔ سسرال میں ان کی ساس نے ان کا نام سردار محمدی بیگم رکھا۔ وہ زندگی بھر لونی میں رہیں اور ۱۹۳۹ء میں فرقہ وارانہ فسادات کے بعد پونے میں منتقل ہو گئیں اور اندازاً چار پانچ سال کے بعد پونے ہی میں ان کا انتقال ہوا۔ انھیں شادی کے تیس سال بعد بھی کوئی اولاد نہیں ہوئی، لہٰذا ان کے شوہر نے دوسرا نکاح کیا۔ دوسری بیوی کا نام تفضیل النسا تھا، سسرال میں ان کا نام اختری بیگم رکھا گیا۔ اختری بیگم کے والد کا نام میر صاحب تھا۔ انھیں بھی شادی کے دس سال بعد لڑکی پیدا ہوئی اور پھر دو بیٹے مصطفیٰ اور مختار پیدا ہوئے۔ یہ بھی پونے ہی میں رہتے تھے۔

سردار محمدی بیگم کی حقیقی پھوپھی زاد بہن کا نام صغرا تھا جو وائی کے نواب کے بھائی کی بیٹی تھیں جن کی شادی بمبئی سے قریب تھانہ کے مشہور وکیل قاضی سعداللہ ابن شہاب الدین جلبانی سے ہوئی۔ ان کے بھی کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ ان کا نام سسرال میں صغرا سے بدل کر اقبال رکھا گیا تھا۔ ان کا انتقال تقریباً پندرہ سال قبل کراچی میں ہوا۔ قاضی سعداللہ کی دوسری بیوی بڑی پیش امام تھیں، ان کی اکلوتی بیٹی سردار ہیں جو آج کل کراچی میں مقیم ہیں۔ ان کی شادی کراچی کے مشہور سیاسی لیڈر بیرسٹر مشیر پیش امام کے چھوٹے بھائی بشیر سے ہوئی۔

لونی، ماں گاؤں تعلقہ کا ایک گاؤں ہے جس میں قاضیات کا عہدہ دیا گیا، وہی یہاں کے علاقوں میں نکاح کے فرائض انجام دیتے تھے۔ یہ لوگ قاضی جلبانی کہلاتے تھے اور زمیندار تھے۔ اسی خاندان کے ایک فرد مولوی غلام محمد جلبانی تھے، جن کی شادی سردار محمدی بیگم سے ہوئی تھی۔ سردار محمدی بیگم تعلیم یافتہ تھیں اور مولوی صاحب کے ساتھ زندگی گزارتے ہوئے ان سے بھی علم و فضل میں استفادہ کیا تھا۔ ان دنوں میں سردار محمدی بیگم لونی کے اطراف کے دیہاتوں میں مسلمان خواتین کو جمع کر کے میلادالنبی کے جلسے منعقد کیا کرتی تھیں اور حضورؐ کے اسوۂ حسنہ پر خود تقریر کرتی تھیں۔ جلسے کی صدارت بھی وہ خود کرتی تھیں اور لڑکیوں کو تقریری مقابلے میں حصہ لینے کے لیے تیار کرتی تھیں۔ انھوں نے اپنے شاگردوں کا ایک حلقہ بنایا تھا جو ان جلسوں میں والنٹیر کا کام انجام دیتی تھیں۔ ان جلسوں میں شریک مہمانوں کی خوب خاطر تواضع کی جاتی تھی۔

سردار محمدی بیگم اس زمانے میں رسالہ عصمت میں باقاعدگی سے مضامین شائع کراتی تھیں۔ ان کی اور ان کے شوہر کی اپنی لائبریری تھی جس سے یہ استفادہ کرتیں۔ آس پاس کی غریب خواتین چٹنی روٹی محبت سے پکا کر ان کے لیے لے آتیں تو یہ ان کے ساتھ بیٹھ کر بخوشی کھا لیتی تھیں۔

لڑکیوں کی تعلیم سے انھیں خصوصی دل چسپی تھی۔ مولوی سر رفیع الدین مہاراشٹر کی ایک ممتاز سیاسی و سماجی شخصیت تھے۔ انھوں نے سابق صوبہ بمبئی میں مسلمانوں کی تعلیم اور اردو کے فروغ میں غیر معمولی دل چسپی لی۔ وہ ملکہ وکٹوریہ کے اردو کے استاد بھی رہ چکے ہیں۔ وہ حکومت بمبئی میں وزیر تعلیم کے عہدے پر بھی فائز رہے۔ بمبئی کے مشہور اسمٰعیل یوسف کالج کی تعمیر میں انھوں نے بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ مولوی سر رفیع الدین کی بیٹی حلیم النسا خاتون تھیں۔ یہ اعلیٰ تعلیم سے سرفراز تھیں اور سرکاری عہدے پر بارہ اضلاع کے لیے ایجوکیشن انسپکٹر تھیں۔ ان کا قیام اپنے والد کے ساتھ پونے میں تھا۔ یہیں پر انھوں نے لڑکیوں کے لیے ایک بورڈنگ ہاؤس قائم کر رکھا تھا۔ حلیم النسا بیگم مختلف اضلاع سے بغرض تعلیم و تربیت لڑکیوں کو جمع کر کے پونا لے آتیں اور انھیں قیام کی سہولتوں کے ساتھ زیور تعلیم سے سرفراز کرتیں۔

محترمہ حشمت النسا سراج الدین (خوش دامن صاحبہ ڈاکٹر عبدالقدوس ۔۔۔۔ سابق پرنسپل مہاراشٹر کالج، بمبئی) نے بتایا کہ ۱۹۳۵ء میں جب مولوی سر رفیع الدین زندہ تھے، وہ (حشمت النسا بیگم اور دوسری لڑکیاں) حلیم النسا بیگم کے اصرار پر پونے میں زیر تعلیم تھیں، جہاں وہ اکثر مولوی سر رفیع الدین کے بنگلے پر جاتیں اور انھیں حسب ضرورت اخبار و رسائل پڑھ کے سناتیں۔ بقول محترمہ حشمت النسا سراج الدین، اس زمانے میں کل دس لڑکیاں کوکن سے بغرض تعلیم پونے میں تھیں جن میں مہاڈ (ضلع رائے گڑھ) کی ماکر خاندان کی مریم بھی زیور آراستہ تھیں۔ لونی کے قاضی خاندان سے حشمت جہاں بنت قاضی کمال، خدیجہ بنت قاضی احمد، انوری بنت بابا صاحب قاضی، فاطمہ بنت اسمٰعیل قاضی اور شریور دمن کی منیرہ گردے تھیں۔ اس ہوسٹل میں اس زمانے میں کل تیس لڑکیاں شریک تھیں اور کھانا پکانے کی ذمہ داری، لڑکیوں کے سپرد ہوتی تھی۔ حلیم النسا بیگم کی ماموں زاد بہن منتظم و نگراں تھیں۔ حلیم النسا بیگم بیشتر کوکن کے اضلاع میں لونی اور کھنڈالا جاتیں۔ محترمہ حشمت النسا بیگم نے بتایا کہ ۱۹۴۱ء میں ان کی شادی کے ایک سال بعد سردار محمدی بیگم جو ان کی تعلیم میں دل چسپی لیتی تھیں انھیں عید میلادالنبی کے جلسے میں شرکت کے لیے بمبئی لے گئیں اور انھیں ریکس ہوٹل (Rex Hotel) میں ٹھہرایا گیا۔ اس وقت ان کے ماموں مولوی غلام محمد جلبانی (شوہر سردار محمدی بیگم) بھی ساتھ تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ انھیں لاؤڈ اسپیکر پر عید میلادالنبی کے جلسے میں نظم پڑھنے کا موقع ملا تھا۔

سردار محمدی بیگم کے جزلی رفیقہ بیگم (بیگم صاحبہ جنجیرہ) سے گہرے مراسم تھے۔ نازلی بیگم نے انھیں پُر تکلف دعوت پر بھی مدعو کیا تھا۔ سردار محمدی بیگم خاندان میں شادی بیاہ کی تقریب کے موقع پر مبارک بادی کی نظمیں اور سہرے بھی لکھا کرتی تھیں۔ حشمت النسا بیگم صاحبہ نے بتایا کہ ان کی نانی کی وفات کے بعد سردار محمدی بیگم نے رسالہ "عصمت" میں ایک مضمون بھی لکھا تھا۔ سردار محمدی بیگم کو اپنے میکے یعنی وائی کے نواب کے گھر سے اکلوتی بیٹی ہونے کی حیثیت سے ماہانہ ایک رقم آیا کرتی تھی جو وہ عام طور پر تعلیمی امور اور میلادالنبی کے جلسوں پر خرچ کیا کرتی تھیں۔ محترمہ حشمت النسا بیگم نے بتایا کہ وہ سردار محمدی بیگم سے متاثر تھیں، لہٰذا خود انھوں نے اپنی بیٹی کا نام عظمت جہاں رکھا۔ سردار محمدی بیگم کو باغبانی کا بہت شوق تھا اور لڑکیوں میں بھی باغبانی کا شوق پیدا کرتی تھیں۔ وہ لمبی آستین کی قمیص اور باہر سفر میں برقعہ بھی پہنتی تھیں۔ انھیں مطالعے کا بہت شوق تھا اور رات بارہ بجے تک مطالعہ اور لکھنے میں مصروف رہتی تھیں۔ کوکن میں اس زمانے میں بجلی نہیں تھی لہٰذا مٹی کے تیل کی بتی کی روشنی میں لکھنے پڑھنے کا کام کرتی تھیں۔ جسمانی اعتبار سے دبلی پتلی اور پُرکشش تھیں اور کروشیا کے کام میں ماہر تھیں۔ وہ غریبوں کی ہمدرد تھیں۔ انھوں نے غریبوں کی امداد کے لیے "مٹھی فنڈ" شروع کیا تھا جس میں عورتوں سے گزارش کی گئی تھی کہ وہ ہر روز کھانا پکاتے وقت مٹھی بھر چاول الگ کیا کریں۔ یہ چاول غریبوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ جب وہ نظمیں کہتیں تو وہ "کھنڈالا" سے محترمہ حشمت النسا بیگم کو بھیجتی تھیں تاکہ وہ ان نظموں کو گانے کے لیے ذہن اور لے تیار کریں۔ حشمت بیگم خوش الحان ہیں۔

(بقیہ صفحہ ۶ پر)

اردو زبان و ادب اور عصری تقاضے

دوسری اور آخری قسط

ڈاکٹر لئیق صلاح (۳۵۴-محمود باغ، آصف نگر، حیدرآباد-۵۰۰۰۲۵)

آج سے تقریباً ڈیڑھ سو سال قبل اردو میں سائنسی علوم کے موضوع پر کتابیں لکھی گئیں جن میں سے بعض طبع زاد تھیں اور کچھ انگریزی و فرانسیسی سے ترجمہ کی ہوئیں۔ یہ کام شمس الامرا ثانی نے اپنے ذاتی دارالترجمہ اور خانگی پریس میں انجام دیا۔ ڈاکٹر یحییٰ نے میڈیکل میں ذریعہ تعلیم اردو رکھا۔ ۱۹۱۹ء سے ۱۹۴۸ء تک ڈگری اور پوسٹ گریجویشن سطح پر جامعہ عثمانیہ کا اردو ذریعہ تعلیم کا تجربہ بہت ہی کامیاب رہا۔ جامعہ عثمانیہ کا یہ اقدام، جب کہ دیسی زبانوں میں تعلیم کی کوئی اور مثال نہیں تھی، واقعی قابل فخر، قابل تعریف و تقلید ہے۔ علی یاور جنگ سابق وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی نے اپنی تقریر میں کہا تھا "میرا عقیدہ اور تجربہ ہے کہ جامعہ عثمانیہ کا تجربہ کامیاب رہا ہے۔ اگر یہ ناکام ہوتا تو مستقبل میں ہندوستانی زبانوں کو ذریعہ تعلیم بنانے کی کوئی امید نہ ہوتی۔

جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل نامور ادیب و صحافی ابراہیم جلیس صاحب نے اپنی جامعہ کو خراج عقیدت اس طرح پیش کیا ہے:

"شاہ عثمان نے علم سے ایسا بھرپور پیار کیا ہے جیسا والہانہ پیار شاہ جہاں نے ممتاز محل سے کیا تھا بلکہ شاہ عثمان تو دنیا بھر سے نرالا بادشاہ ہے جس نے اپنے لیے یا کسی فرد واحد کے لیے کوئی عیش گاہ، کوئی شیش محل، کوئی مقبرہ یا کوئی قلعہ تعمیر کرنے کے بجائے سارے انسانوں کے لیے ایک ایسی درسگاہ تعمیر کر دیا جو اسی طرح دنیا کا سرتاج بن گئی ہے جس طرح قطب مینار، تاج محل یا ایلورہ، اجنتا۔ میں تو جامعہ عثمانیہ کو بلاشبہ دنیا کا نواں عجوبہ سمجھتا ہوں۔"

ہم کو اپنے حقوق کا مطالبہ کرنا چاہیے۔ لیکن کیسے نعرہ بازی یا پروپیگنڈے کی صورت میں نہیں۔ باشعور طریقے سے، سنجیدگی کے ساتھ، صرف جوش کے ساتھ نہیں، ہوش کے ساتھ۔ اردو والے دوسری سرکاری زبان بنانے کا مطالبہ تو زور و شور سے کرتے ہیں لیکن اردو کی نئی نسل کو تیار کرنے کی طرف توجہ کم ہوتی ہے جس کی وجہ سے نہ تو اردو میں درخواست پیش کرنے والا ہی کوئی دستیاب ہوتا ہے اور نہ اردو میں درخواست قبول کرنے والا۔ اب اس زبان کی انتظامیہ میں گنجائش کیسے نکل سکے گی اور جب انتظامیہ میں گنجائش نہ نکلے تو روٹی اور روزی کا سوال بھی ادھورا رہ جائے گا۔ حکومت کی طرف سے جو مراعات مل رہی ہیں اسے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا سمجھیں۔ اس سے جس قدر فائدہ اٹھا سکتے ہیں اٹھائیں اور یہ ثابت کریں کہ ہم صرف مطالبہ کرنے والوں میں سے نہیں بلکہ حق ادا کرنے والے بھی ہیں۔

ریاستی اکاڈمیاں ہیں، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے علاوہ این۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی جیسے اداروں سے اردو کی کتابیں شائع ہوتی ہیں اور گجرال کمیٹی کی سفارشات کا زریں تحفہ مولانا ابوالکلام آزاد اردو یونیورسٹی کے روپ میں ہمارے درمیان موجود ہے۔ پھر ہم اپنے آپ کو بے بس کیوں سمجھیں؟ دیانت داری اور خلوص کے ساتھ کام ہو تو اردو کو اس کا وہ مقام پھر سے دلا سکیں گے۔ اردو کا چرچا ان ایوانوں میں ہو گا جہاں خاموشی، سکوت اور سناٹا تھا۔ اردو کے اجلاسوں، مذاکروں، کانفرنسوں، مشاعروں وغیرہ میں نئی نسل نظر آئے گی۔ رسائل اور اخبارات کے مدیروں کو قاری دستیاب ہوں گے، پبلشر زیادہ سے زیادہ کتابوں کی طباعت و اشاعت میں مصروف ہوں گے۔ بشرطیکہ پڑھنے اور پڑھانے والے دونوں سنجیدگی سے اس طرف متوجہ ہوں۔

اردو یونیورسٹی کے استحکام کا دارومدار صرف مالی اعانت اور انتظامیہ کی بہتر کارکردگی ہی پر نہیں بلکہ پڑھنے والوں کی تعداد اور ان کے معیار پر ہے۔ اس کے لیے حتی الامکان کوشش کرنی چاہیے کہ مطالبے کا حق ایک فریضے کے طور پر ادا ہو۔ یونیورسٹی کے مراکز ممکن ہے بیرون ہند بھی قائم ہوں، یونیورسٹی کے تجربہ کاروں سے کارکردگی کا علم ہوتا ہے کام کی رفتار تیز ہے۔ دوسری جامعات سے مقابلہ کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ صرف فاصلاتی تعلیم کی یونیورسٹی نہیں بلکہ ذریعہ تعلیم بھی مختلف ہے جس کے لیے معیاری نصاب کا ہونا جو عصری تقاضوں کو پورا کر سکے بے حد ضروری ہے۔

اردو یونیورسٹی کے علاوہ اردو مدرسے بھی ہماری توجہ کے محتاج ہیں۔ اردو مدرسوں کے معیار کو بلند کرنے کے ساتھ ان مدرسوں کی ضروریات کو بھی رضاکارانہ طور پر مالی تعاون کے ذریعے پورا کرنا چاہیے۔

ہم میں سے اکثر افراد اردو کے مستقبل سے مایوس ہیں یا پھر احساس کمتری کا شکار ہیں۔ انھیں اس بات کا ضرور علم ہو گا کہ فیض احمد فیض انگریزی کے پروفیسر تھے اور فدا احمد ڈار کے قرۃ العین حیدر، انگریزی کی پروفیسر رہ چکی ہیں لیکن ان لوگوں کی تخلیقات کس زبان میں ہیں؟ ان کو شہرت کس زبان سے حاصل ہوئی۔ اس دور کے اور بھی ادبا ہیں مثلاً مشتاق احمد یوسفی، شمس الرحمٰن فاروقی وغیرہ جو پیشے کے اعتبار سے اردو کے معلم نہیں بلکہ وہ سب محکموں جیسے بینکنگ، پوسٹ اینڈ ٹیلی گراف سے وابستہ رہے ہیں اور عالم گیر شہرت و اعزازات کے حامل ہوئے اردو کی تحریروں کے سبب۔

مذکورہ بالا ممتاز و معروف ہستیوں میں بعض کی مادری زبان اردو ہے یا پھر وہ زبان داں کہلانے کے مستحق ہیں لیکن چند ایسے افراد بھی ہیں جن کی مادری زبان اردو نہیں صرف اس زبان سے ان کی دلچسپی اس سے وابستگی کا سبب بنی ہے۔

جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

ڈاکٹر بلرام گپتا (موظف) پروفیسر شعبۂ انگریزی کا پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ کسی انگریزی کے مصنف یا شاعر کے بارے میں نہیں ہے۔ ان کا کام خواجہ احمد عباس پر ہوا ہے۔ علاوہ ازیں وہ ایک جرنل نکالتے ہیں جو شائع ہوتا ہے The Indian Writing in English اور جس کا ایک شمارہ ترقی پسند تحریک کی معروف شخصیت "احمد علی کے فن اور شخصیت" سے متعلق ہے۔ اس میں بعض معلومات ایسی فراہم کی گئی ہیں جن کا ذکر اردو کی کتابوں اور رسالوں میں نہیں۔ اس کا ایک نسخہ میں نے محترم خلیق انجم کی نذر کیا ہے ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ جامعہ کشمیر کے ہندی شعبے میں تحقیقی کام راہی معصوم رضا پر ہو رہا ہے۔ ہندوستان کے دیگر شعبہ جات یا اداروں میں وہ زبان جس کو معمولی سمجھا جا رہا ہے اہمیت دی جا رہی ہو گی جس سے اردو والے لاعلم ہیں۔ لہٰذا ناامیدی صرف کفر نہیں بلکہ جرم سمجھ کر اردو زبان و ادب کے فروغ و اشاعت کی طرف توجہ کریں اور اس کے معیار کی بلندی کو بھی پیش نظر رکھیں تب اردو اکیسویں صدی سے آگے بھی پورے کر و فر اور شان و عظمت کے ساتھ برقرار رہ سکتی ہے۔ ہم ایک پل صراط پر سے گزر رہے ہیں، ذرا سی لغزش نقصان دہ بھی ثابت ہو سکتی ہے یا پھر ہم اپنی منزل تک سلامتی کے ساتھ پہنچ سکتے ہیں۔

حوالے

۱۔ ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال "حیدرآباد میں اردو کی ترقی تعلیمی اور سرکاری زبان کی حیثیت سے" ص ۲۱-۲۲۔

۲۔ ایضاً ص ۱۸۱، مطبوعہ شگوفہ پبلی کیشنز ۳۱-۶-۶ معظم جاہی مارکیٹ، حیدرآباد ۱۹۹۰ء۔

۳۔ پروفیسر شفقت رضوی (مقدمہ) تاریخ نامدار پڑگاہ، ص ۱۹۔

4- Prof. G.S. Balarama Gupta. Editor The Journal of Indian Writing in English. Vol 23 Jan, July 1995. No 1&2.

"ہماری زبان" کا علی سردار جعفری نمبر

کچھ دن پہلے ہم نے مجروحؔ سلطانپوری کی وفات پر "ہماری زبان" کا مجروح نمبر شائع کیا تھا۔ اب انتہائی دکھ کے ساتھ اعلان کرنا پڑ رہا ہے کہ اب ہمیں "ہماری زبان" کا علی سردار جعفری نمبر شائع کرنا ہے۔ اس خاص نمبر میں علی سردار جعفری مرحوم کی شخصیت اور فن کے مختلف پہلوؤں پر ادیبوں، نقادوں اور سردار جعفری مرحوم کے مداحوں کے مضامین، تاثرات اور تعزیتی جلسوں کی رپورٹیں شامل ہوں گی۔ ادیبوں، نقادوں اور سردار جعفری مرحوم کے مداحوں سے درخواست ہے کہ وہ اپنے مضامین یا تاثرات جلد از جلد ارسال فرمائیں۔

(ادارہ)

اردو دُنیا

عالیہ جونیر کالج میں اردو کی تدریس کا مسئلہ

حیدر آباد۔ ڈاکٹر سید عبدالستان صدر انجمن ترقی اردو (آندھرا پردیش) نے اپنے ایک مراسلے میں سکریٹری بورڈ آف انٹرمیڈیٹ سے خواہش کی ہے کہ گورنمنٹ جونیر کالج عالیہ میں اردو زبان اول کی تدریس کے سابقہ انتظام کو برقرار رکھا جائے۔ ابتدائی اطلاعات سے یہ معلوم ہوا کہ اردو لکچرر کے وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہو جانے کے بعد متبادل انتظام نہیں کیا گیا اور اردو زبان اول اختیار کرنے والے طلبہ کے داخلہ فارمس قبول نہیں کیے گئے۔ ڈاکٹر ستان نے اپنے مراسلے میں لکھا ہے کہ مدرسہ عالیہ ایک قدیم تعلیمی ادارہ ہے جہاں ابتداء ہی سے اردو تعلیم کا انتظام رہا ہے اور اس ادارے سے فارغ التحصیل طلبہ نے صرف ہندوستان میں بلکہ بیرون ملک میں بھی ادارے کا نام روشن کیا۔ انھوں نے سکریٹری سے درخواست کی ہے کہ سابقہ انتظام کو بحال کیا جائے اور اردو زبان اول کے طلبہ کی درخواستوں کو داخلہ کے لیے قبول کیا جائے۔

(منصف۔ حیدر آباد)

اسلامیہ کالج میں اردو لکچرر کی تقرری کا مطالبہ

بریلی۔ مقامی سوشل ورکر جناب شرافت اللہ خاں نے اسلامیہ انٹر کالج میں اردو کے لکچرر کی تقرری نہ کیے جانے پر اظہار افسوس کرتے ہوئے انتظامیہ سے اپنا رویہ بدلنے کی اپیل کی ہے۔

شرافت اللہ خاں صاحب کا کہنا ہے کہ تعلیمی ادارے میں اردو کا لکچرر نہ ہونا شرم کا مقام ہے اور انتظامیہ کے اس رویے سے جب اردو کی تعلیم اور تدریس پر سوالیہ نشان لگ گیا ہے۔

شرافت اللہ خاں صاحب نے وزیر اعلیٰ سے مطالبہ کیا ہے کہ روہیل کھنڈ یونیورسٹی سے ملحق تمام ڈگری کالجوں میں اردو کے لکچرروں کا تقرر کیا جائے۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

امبیڈکر نگر کے اردو اساتذہ ٹرینڈ گریڈ کی تنخواہ سے محروم

امبیڈکر نگر۔ ضلع میں تعینات اردو اساتذہ کو محکمہ تعلیم کے سوتیلے پن کے سبب ٹرینڈ گریڈ کی تنخواہ نہیں دی جا رہی ہے۔ محکمہ تعلیم کے اعلا افسران اور ضلع افسران کے رویے سے تنگ اردو اساتذہ نے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے کا موڈ بنایا ہے۔ یاد رہے کہ دسمبر ۱۹۹۲ء میں ضلع امبیڈکر نگر میں اردو اساتذہ کا تقرر ملائم سنگھ یادو کے دور اقتدار میں ہوا تھا محکمہ جاتی ٹریننگ لینے کے بعد ابھی تک ٹرینڈ گریڈ ان اساتذہ کو نہیں ملا ہے۔ ضلع کے اردو اساتذہ کے ایک وفد نے ضلع بیسک شکشا ادھیکاری کو ایک میمورنڈم دے کر اردو اساتذہ کو ٹرینڈ گریڈ دینے کا مطالبہ کیا ہے۔ عرصہ سے اردو اساتذہ محکمہ تعلیم کے وزیر اور ڈائرکٹر اور دوسرے دیگر حکام کو اپنے مسائل سے آگاہ کرتے رہے ہیں مگر اب تک ان کی شنوائی نہیں ہوئی ہے۔ اردو اساتذہ تنظیم کے وسیم احمد، سعید حسن، عباس علی، علی اختر، علی احمد وغیرہ نے بتایا کہ اب اردو اساتذہ اپنے مسائل کو حل کرانے کے لیے عدالت سے رجوع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

اردو پرائمری اسکول شیرزہ خاں پیٹ میں مزید اساتذہ کے تقرر کا مطالبہ

کوہیر۔ کوہیر کے قریبی موضع شیرزہ خاں پیٹ میں پانچ سال قبل اردو پرائمری اسکول کا قیام عمل میں آیا تب سے صرف ایک مدرس کے ذریعے تعلیم کا نظم تاحال ہے۔ مقامی عوام اردو کا مطالبہ ہے کہ اب جب کہ اساتذہ کے تقررات بلالحاظ میں عمل میں آنے والے ہیں دو اردو اساتذہ کو شیرزہ خاں پیٹ پرائمری اسکول میں تقرر کیا جائے۔

(سیاست۔ حیدر آباد)

غیر اردو داں اساتذہ کی تقرری پر تنقید

نئی دہلی۔ جامع مسجد سکنڈری اسکول میں مبینہ طور پر اردو زبان سے واقفیت نہ رکھنے والے اساتذہ کی تقرری پر "آواز تحفظ اردو زبان کمیٹی" نے دہلی سرکار کے فیصلے کی سخت تنقید کی ہے۔ کمیٹی کا کہنا ہے کہ ایک طرف تو اردو میڈیم اسکولوں میں اردو زبان میں نصاب کی کمی کی وجہ سے بچوں کو پریشانی اٹھانی پڑ رہی ہے تو دوسری طرف دہلی سرکار نے اردو میڈیم اسکول میں اردو نہ جاننے والے اساتذہ کا تقرر کر کے بچوں کے مستقبل کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔ کمیٹی کے عہدیداران نے دہلی سرکار سے تمام اردو میڈیم اسکولوں میں اساتذہ کی خالی اسامیاں فوری پر کرنے کا مطالبہ کیا اور کہا کہ ان اسکولوں میں اردو میں پڑھانے والے اساتذہ کو ہی ملازمت پر رکھا جائے اور اردو نصاب کی کمی کو فوری دور کیا جائے۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

ابراہیم پور اسکول میں اردو کی جگہ ہندی ٹیچر بحال کیے جانے پر غصہ

سیتامڑھی۔ بہار سرکار اردو کے خاتمے کی جو گہری سازش رچ رہی ہے اس میں اردو کی جگہ ہندی ٹیچر بحال کرنا بھی جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ سیتامڑھی ضلع کے رونی سید پور بلاک کے ابراہیم پور پرائمری اسکول میں اردو کی جگہ ہندی ٹیچر بحال کر دیا گیا ہے۔

واضح ہو کہ ابراہیم پور اسکول میں گزشتہ چار سالوں سے اردو ٹیچر کی جگہ خالی پڑی تھی جس کی خبر "قومی تنظیم" اخبار میں کئی دفعہ شائع ہوئی۔ اور "قومی تنظیم" میں خبر چھپنے کے بعد فوراً ابراہیم پور اسکول میں ٹیچر بحال کیے گئے مگر افسوس کہ اردو ٹیچر کی جگہ ہندی ٹیچر دے کر عوام کو بحال کر دیا گیا جس سے وہاں کے اردو عوام میں کافی غم و غصہ ہے۔ ایک تو چار سالوں کے بعد دوسرے ٹیچر آئے بھی تو ہندی کے، جب کہ ابراہیم پور پرائمری اسکول میں گزشتہ تین برسوں سے اردو ٹیچر مسلسل تھے اور اس اسکول میں ابھی بھی اردو پڑھنے والے طلبہ و طالبات کی تعداد ۶۵ ہے۔ اس سلسلے میں بھارتیہ کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر جناب عبدالکریم راعین نے موجودہ رابڑی سرکار سے مطالبہ کیا ہے کہ جلد سے جلد سیتامڑھی ضلع میں جن اسکولوں میں اردو کی جگہ ہندی ٹیچر بحال کیے گئے ہیں وہاں اردو ٹیچر بحال کیے جائیں اور ہندی ٹیچر کو کسی ہندی اسکول میں بھیجا جائے اور خاص کر ابراہیم پور اسکول میں اردو کی جگہ ہندی ٹیچر کو ہٹا کر فوراً اردو ٹیچر بحال کرنے کا حکم ضلع کے تعلیمی افسر کو دیں تاکہ اردو بچوں کی تعلیم برباد نہ ہو سکے۔

(قومی تنظیم۔ پٹنہ)

اردو میں ایم۔ اے کرنے والی مراٹھی داں خاتون ایڈوکیٹ کرن دھوڑ

ناگپور۔ (ڈاک سے) کرن دھوڑ نے ناگپور یونیورسٹی سے اردو ادب میں ایم۔ اے کے امتحان میں ۶۴ فیصدی نمبر حاصل کر کے نمایاں کامیابی حاصل کی۔ وہ ناگپور شہر کی پہلی مراٹھی داں خاتون ہیں جنھوں نے ناگپور یونیورسٹی سے اردو ادب میں ایم۔ اے کی سند حاصل کی ہے۔ انھوں نے اس سے قبل ناگپور یونیورسٹی سے ہی ایل۔ ایل۔ بی کی ڈگری حاصل کی ہے۔

محترمہ کرن دھوڑ پردیش کانگریس کمیٹی کے صدر اور سابق ایم۔ ایل۔ اے اشوک دھوڑ کی شریک حیات ہیں۔ ان کا ارادہ ہے کہ وہ اردو ادب کے زندہ جاوید شہ پاروں کا مراٹھی میں ترجمہ کریں گی۔ انھیں اس بات کا اعتراف ہے کہ جناب قمر حیات کی رہنمائی کی بدولت ہی انھیں یہ کامیابی حاصل ہوئی ہے۔

انھوں نے "اردو ادب میں گنگا جمنی تہذیب" کے عنوان سے پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے ناگپور یونیورسٹی سے رجسٹریشن کروایا ہے اور اپنا تحقیقی کام ڈاکٹر شفاء الرحمن خاں شفا کے زیر نگرانی کر رہی ہیں۔

اردو اساتذہ کی تقرری کا مطالبہ

پرائمری اسکول اردو میڈیم مدور ضلع محبوب نگر کا قدیم ترین اسکول ہے۔ جہاں تقریباً ۲۰ سال سے اردو تعلیم کا نظم ہے۔ ۲۰۰ طلبہ کے لیے صرف دو اساتذہ کی تعیناتی عمل میں لائی گئی ہے۔ منڈل مدور میں اردو اساتذہ کی موجودگی کے باوجود اردو اساتذہ کو اردو پرائمری اسکولوں کے بجائے تلگو مدارس پر تعینات کیا گیا ہے۔ مقامی عوام کا مطالبہ ہے کہ تلگو مدارس پر مامور اردو اساتذہ کا فوری اثر کے ساتھ اردو مدارس پر تبادلہ عمل میں لایا جائے۔

(سیاست۔ حیدر آباد)

❋◆❋◆❋◆❋◆❋

"ہماری زبان" کا مجروح سلطانپوری نمبر شائع ہو گیا ہے

"ہماری زبان" کا مجروح سلطانپوری نمبر شائع ہو گیا ہے جس میں مجروح کی شخصیت اور خدمات کے گوناگوں پہلوؤں پر ہمارے عہد کے ادیبوں، شاعروں اور نقادوں کے مضامین اور تاثرات شامل ہیں۔ بلاشبہ یہ خاص نمبر مجروح کی شخصیت اور ان کے کارناموں پر بھرپور روشنی ڈالتا ہے۔ مجروح سلطانپوری نمبر کی کچھ کاپیاں ابھی محفوظ ہیں۔ اگر کسی صاحب کو ضرورت ہو تو وہ انجمن ترقی اردو (ہند) اردو گھر، ۲۱۲- راؤز ایونیو، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲ سے حاصل کر سکتے ہیں۔ اس نمبر کی ضخامت ۳۲ صفحات ہے اور قیمت صرف تین روپے۔ (ادارہ)

نوری اردو اکادمی و لائبریری برہولیا دربھنگہ کا سالانہ انتخاب اور اردو مسائل پر گفتگو

برہولیا دربھنگہ (ڈاک سے)

نوری اردو اکادمی و لائبریری کی سالانہ نشست گزشتہ دنوں جناب جواد ہاشمی کے دولت کدے پر زیر صدارت جناب شعیب قیس ہوئی۔ نظامت کے فرائض جناب اظہر نیر نے انجام دیے۔ سب سے پہلے اردو کے ممتاز ترقی پسند غزل گو شاعر اور ہندی فلموں کے مقبول نغمہ نگار حضرت مجروح سلطانپوری اور ملک کے مشہور ناظم مشاعرہ جناب تسکین حیدر کے سانحہ ارتحال پر قرارداد تعزیت پیش کی گئی۔ اظہر نیر نے مجروح سلطانپوری اور تسکین حیدر کے فن اور شخصیت اور ان کی خدمات پر روشنی ڈالی اور انھیں خراج عقیدت پیش کیا۔

اظہر نیر صاحب نے گزشتہ سال کی روداد و سکریٹری رپورٹ پیش کیا۔ خازن جناب مسیح احمد رہبر نے سالانہ خرچ و آمدنی کا حساب دیا۔ مقررین نے اردو کے مسائل کو حل کرنے میں خود اردو والوں کی عدم دلچسپی اور غفلت کا بھی ذکر کیا۔ نشست کے صدر جناب شعیب قیس نے حکومت سے پرائمری اسکولوں سے ہی ذریعہ تعلیم اردو قرار دینے کی سفارش کی اور ساتھ ہی غیر سرکاری اسکولوں میں بھی ابتدائی تعلیم اردو کے ذریعہ دینے پر زور دیا اور کہا کہ

گرامی نامے

ادارے کا مراسلہ نگاروں سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے

"ہماری زبان" کا مجروح سلطانپوری نمبر

مکرمی! "ہماری زبان" کا مجروح سلطانپوری نمبر ملا۔ بلاشبہ آپ نے کم وقت میں مرحوم کی یاد میں ایک قیمتی نمبر نکالنے میں کامیابی حاصل کی۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ اس میں بہت سے لوگوں کے تاثرات یکجا ہو گئے ہیں۔ آپ اس اہم کام کے لیے مجروح سلطانپوری کے قدر دانوں کے شکریے کے مستحق ہیں۔

صفحہ ۲ پر "گل کاری وحشت کا شاعر مجروح" کا اشتہار دیکھا یقین ہے کہ یہ کتاب بھی قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

(عبدالقوی دسنوی۔ بھوپال)

(۲)

مکرمی! "ہماری زبان" کا مجروح سلطانپوری نمبر موصول ہوا۔ مطالعہ کیا اور حیات مجروح سے متعلق بہت سی باتوں کا انکشاف ہوا۔ یہ سب آپ کی مجروح سے عقیدت کی بنا پر ہو سکا جس کے لیے آپ صرف شکریے کے نہیں داد کے بھی مستحق ہیں۔ ایک بار پھر آپ نے بازی جیت لی۔ کیوں کہ "ہماری زبان" اردو کا پہلا اخبار ہے جس نے مجروح نمبر شائع کیا۔ جملہ مضامین بہت پسند آئے۔ آپ نے مجروح سلطانپوری سے متعلق ایک کتاب بھی مرتب کی اور شائع کر رہے ہیں یہ بہت بڑی بات ہے۔ خدا آپ کو اس کا اجر عطا کرے۔

(تسلیم غوری بدایونی)

(۳)

مکرمی! "ہماری زبان" کا مجروح سلطانپوری نمبر موصول ہوا ممنون ہوں۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ کتابی شکل میں "گل کاری وحشت کا شاعر مجروح" کے نام سے ایک مجلہ شائع فرما رہے ہیں۔ جن میں بہت سے قلم کار حضرات شامل ہیں۔

(ذکاء الدین شایان۔ پیلی بھیت)

(۴)

مکرمی! "ہماری زبان" کا مجروح سلطانپوری نمبر نظر نواز ہوا۔ بہت کم وقت میں آپ نے بہت زیادہ معلومات فراہم کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ مجروح نمبر کو واقعی مجروح سلطانپوری (مرحوم) کی شایان شان کہا جا سکتا ہے اور اس کامیابی کے لیے آپ مبارک باد کے مستحق ہیں۔

(مظفر صدیقی)

(۵)

مکرمی! "ہماری زبان" کا مجروح سلطانپوری نمبر دستیاب ہوا۔ ماشاء اللہ اس نمبر کی اشاعت سے مجروح صاحب کی شخصیت اور ان کی ادبی خدمات کے اعلا مراتب کا اعتراف کرتے ہوئے ان کو خراج عقیدت پیش کرنے کا بہترین حق ادا کیا گیا ہے۔ اس کے لیے آپ مبارک باد کے مستحق ہیں۔

(کوثر جعفری۔ جگتل)

تمام سرکاری پرائمری اسکولوں سے لے کر اعلا درجہ تک اردو کی تعلیم کا انتظام درست کرتے اور جہاں استادوں کی ضرورت ہے وہاں انتظام کیا جائے۔ سامعین و اراکین کی متفقہ رائے سے ۲۰۰۰-۲۰۰۱ء کے لیے نئے عہدیداروں کا انتخاب عمل میں آیا۔ صدر جناب اعجاز ظفر، نائب صدر جناب شوکت حسین اور قمر رحمانی، سکریٹری اظہر نیر، جوائنٹ سکریٹری آفاق ہاشمی، ڈاکٹر مطلوب انور اور خازن سید محمد زبیر۔

اس موقع پر شعری نشست کا بھی اہتمام کیا گیا۔ آفاق ہاشمی صاحب نے شکریہ ادا کیا۔

(مطلوب انور)

جمشید پور ویمنس کالج میں اردو کا مستقبل خطرے میں

جمشید پور۔ جنوری میں اردو لیکچر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے ڈاکٹر مناظر احسن کے مطابق آج تک اردو لیکچرر کی حیثیت سے رانچی یونیورسٹی نے کسی کی تقرری نہیں کی۔ نتیجے میں اردو طالبات کو سخت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور ان کی پڑھائی پوری طرح ٹھپ ہے۔ واضح رہے کہ تین سالہ ڈگری کورس سیٹ آنرز کے لیے بھی ڈاکٹر احسن تن تنہا اس کالج میں اردو کا جھنڈا بلند کیے ہوئے تھے۔

ذرائع کے مطابق کالج کی پرنسپل محترمہ پربھا ستیا کی عدم توجہی اور اردو درس و تدریس سے ان کی دوری کے سبب یہ صورت حال پیدا ہوئی ہے۔ ذرائع نے یہ بھی انکشاف کیا کہ یونیورسٹی وہ ادارہ اس کالج سے مکمل طور پر اردو شعبے کا خاتمہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ سات ماہ گزر جانے کے باوجود یہاں اردو لیکچرر کا عہدہ خالی ہے۔ نئے سیشن

اردو ملازمین کا تبادلہ
ایک سوچی سمجھی سازش

پٹنہ۔ محکمہ راج بھاشا کے ذریعے ہر سال اقلیتی فرقے سے تعلق رکھنے والے اردو ملازمین کا تبادلہ ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت دور دراز کے علاقوں میں کر دیا جاتا ہے۔ خواتین اردو ملازمین کو بھی نہیں بخشا جاتا ہے بلکہ انھیں خاص کر تنگ کرنے کی غرض سے دور دراز کے علاقوں میں بھیج دیا جاتا ہے تاکہ وہ نوکری چھوڑ دینے پر مجبور ہو جائیں۔ ان خیالات کا اظہار پٹنہ مہا نگر راشٹریہ جنتا دل کے صدر جناب خورشید عالم صدیقی نے ایک اخباری بیان جاری کر کے کیا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ تبادلے میں ضلع کی قید صرف اس لیے لگائی ہے کہ اقلیتی فرقے کے اردو ملازمین کو برباد کیا جا سکے۔ واضح رہے کہ اس محکمے کے عملے اس قدر بد عنوان ہیں کہ بغیر رشوت لیے کسی کا بھی تبادلہ نہیں کرتے ہیں۔ ٹرانسفر پوسٹنگ کے علاوہ انھیں کسی دوسرے کام سے کوئی دل چسپی نہیں ہے۔

جناب صدیقی نے مزید کہا کہ محکمے کے ذریعے اقلیتی فرقے کا استحصال کسی بھی قیمت پر برداشت نہیں کریں گے اور اگر محکمے نے اردو ملازمین کے مسائل پر فوری توجہ نہیں دی اور ضلع کی قید ختم نہیں کی تو وہ اس ناانصافی کے خلاف اپنے ہم نواؤں کے ساتھ سڑکوں پر اتر آئیں گے اور محکمے کا گھیراؤ کریں گے۔

(قومی آواز۔ نئی دہلی)

ضلع عادل آباد میں اردو میڈیم ڈگری کالج کی ضرورت

ضلع عادل آباد میں اردو میڈیم ڈگری کالج کے نہ ہونے سے اردو میڈیم طلبہ کو کئی ایک مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور انھیں انٹر میڈیٹ کی تکمیل کے بعد اعلا تعلیم کے لیے دیگر شہروں کا رخ کرنا پڑ رہا ہے۔ ضلع عادل آباد کے نرمل میں جہاں اردو داں طبقے کی کثیر تعداد ہے اردو میڈیم ڈگری کالج کی شدید ضرورت ہے۔ وزیر تعلیم اور ارکان اسمبلی مجلس اتحاد المسلمین سے گزارش ہے کہ وہ نرمل میں اردو میڈیم ڈگری کالج کے قیام کے لیے ضروری اقدامات کریں۔

(محسن احمد)

میں اردو طالبات کا داخلہ بھی لیکچرر کی عدم موجودگی سے متاثر ہو رہا ہے۔ اس ضمن میں ذمہ دار تنظیموں اور سیاسی رہنماؤں کو فوری پیش قدمی کرنے کی ضرورت ہے۔

(آبشار۔ کلکتہ)

گورنمنٹ جونیر کالج اردو میڈیم بھینسہ میں ایم پی سی اور سی ای سی سکشن قائم کرنے کا مطالبہ

بھینسہ۔ جناب محمد منہاج الحق سکریٹری مدینہ ایجوکیشنل سوسائٹی نے صحافتی بیان میں ریاستی حکومت سے گورنمنٹ جونیر کالج بھینسہ میں ایم پی سی اور سی ای سی اردو میڈیم سکشن قائم کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو میڈیم سے ایس ایس سی کامیاب طلبہ گورنمنٹ جونیر کالج بھینسہ میں ایم پی سی اور سی ای سی کی سہولت نہ ہونے کے سبب دیگر مقامات کے کالجوں میں داخلہ حاصل کرتے ہوئے اپنے تعلیمی سفر کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ انھوں نے ریاستی حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ رواں تعلیمی سال سے گورنمنٹ جونیر کالج بھینسہ میں ایم پی سی اور سی ای سی اردو میڈیم کے سکشن قائم کرنے کے اقدامات کرے۔ (سیاست۔ حیدرآباد)

پرنسپل ایم وی ایس آرٹس اینڈ سائنس کالج محبوب نگر کا مخالف اردو رویہ

محبوب نگر۔ گورنمنٹ ایم وی ایس آرٹس اینڈ سائنس کالج محبوب نگر میں اردو داخلہ کامیاب امیدواروں کو میرٹ کی بنیاد پر داخلہ دینے سے پرنسپل کا انکار معنی خیز ہے جب کہ گزشتہ سال ایسے امیدواروں کو داخلہ میرٹ کی بنیاد پر دیا گیا تھا۔ جناب مجیب سہروردی اور ان کے رفقا جناب تصیر الحسن، جناب نصیر الدین اور جناب مرزا شفیق قدوس بیگ نے مشترکہ اخباری بیان میں بتایا۔ ان لوگوں نے پرنسپل ایم وی ایس کالج پر مخالف اردو رویہ اختیار کرنے کا الزام عائد کیا اور کہا کہ پرنسپل کالج ہذا نے نہ صرف داخلوں پر امتناع عائد کیا ہے بلکہ اب تک کے داخلوں کو منسوخ کرنے کے اقدامات کر رہے ہیں اور انھیں عثمانیہ یونیورسٹی اور حکومت کے احکام کی تعمیل کی پروا نہیں۔ جناب سہروردی نے وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی سے پرزور اپیل کی ہے کہ وہ اردو داخلہ کامیاب امیدواروں کے داخلوں کو یقینی بنانے کے لیے ضروری احکام جاری کریں۔ (سیاست۔ حیدرآباد)

کلواکرتی میں انٹر میڈیٹ اردو میڈیم کی متوازی جماعتوں کے قیام کا مطالبہ

کلواکرتی۔ جناب محمد نعیم نے صحافتی بیان میں حکومت سے مطالبہ کیا کہ کلواکرتی میں انٹر میڈیٹ تلگو میڈیم کے ساتھ اردو میڈیم کی متوازی جماعتوں کا قیام عمل میں لایا جائے۔ انھوں نے کہا کہ یہاں اردو میڈیم جماعتیں نہ ہونے سے ایس ایس سی اردو کامیاب طلبہ و طالبات اعلا تعلیم کے حصول سے محروم ہو گئے ہیں۔ انھوں نے جونیر کالج میں تلگو کے ساتھ اردو میڈیم انٹر میڈیٹ کی جماعتوں کا آغاز کرنے کی ریاستی حکومت اور ارباب مجاز تنظیمات سے اپیل کی۔

(سیاست۔ حیدرآباد)

اک دیا اور بجھا

ممبئی۔ اردو کے مشہور شاعر اور صحافی جناب انجم رومانی کا ۲۶، ۲۷ جولائی ۲۰۰۰ء کی درمیانی شب میں دو بجے عرب گلی، ممبئی ۸ کے فوزیہ نرسنگ ہوم میں انتقال ہو گیا۔ ان کی عمر ۶۳ سال تھی۔ پس ماندگان میں چار بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔ انجم رومانی قلب کے عارضے میں مبتلا تھے اور گزشتہ چند روز سے ان کے پیر سے کی داہنی جانب لقوہ کا اثر بھی تھا۔ ۲۷ جولائی کو دوپہر میں انھیں ناریل واڑی قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ مرحوم ۱۹۶۳ء میں روزنامہ "اردو ٹائمز" سے وابستہ ہوئے تھے۔ مختلف ادارتی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ اس اخبار کا ادبی صفحہ "لوح و قلم" بھی وہی مرتب کیا کرتے تھے۔ طویل صحافتی خدمات کے بعد چند برس قبل وہ ادارہ ٹائمز سے ریٹائر ہوئے تھے۔ انجم رومانی ترقی پسند تحریک کے دور سے لے کر بیسویں صدی کی اس آخری دہائی تک ہندوستان کے اہم مشاعروں میں ہمیشہ بلائے جاتے رہے۔ خاص طور سے خاندیش اور ودربھ کے علاقوں میں وہ بہت مقبول تھے۔

انجم رومانی کا مجموعہ کلام "روشنی بے چراغ راتوں کی" شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے۔ اس کتاب کا اجرا دلیپ کمار کے ہاتھوں ہوا تھا۔

ادارہ "ہماری زبان" مرحوم کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

(۲)

نئی دہلی۔ اردو کے مشہور شاعر اور ادیب جناب نصیر الدین ثاقب عباسی کا ۲۹ جولائی ۲۰۰۰ء کو ان کے آبائی وطن مئو آئمہ میں انتقال ہو گیا۔ وہ طویل عرصے سے کینسر کے عارضے میں مبتلا تھے۔ پس ماندگان میں تین بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔ مرحوم دہلی سے شائع ہونے والے سہ روزہ "دعوت" سے طویل عرصے تک وابستہ رہے۔

ادارہ "ہماری زبان" مرحوم کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : خواب اور تعبیر خواب (منظوم ڈرامہ)
مصنف : رفعت سروش
ضخامت : ۴۸ صفحات
قیمت : ۲۵ روپے
ملنے کا پتا : نورنگ کتاب گھر ۸۰ سیکٹر ۲ نوئیڈا
تبصرہ نگار : ڈاکٹر رضیہ حامد

آج ہم مِلینیم سال میں پہنچ گئے ہیں۔ یہ سال بیسویں صدی کا آخری پڑاؤ ہے۔ بیسویں صدی ہندوستان کی تاریخ میں بڑی اہمیت کی حامل ہے کیوں کہ اس صدی کے ابتدا سے ہی برطانوی سامراج سے آزادی کی جدوجہد تیز اور تیز تر ہوتی گئی۔ سامراجی مظالم بڑھتے گئے اور آزادی کے دیوانوں نے علی الاعلان کہا

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے

اور یہ تمنا رنگ لائی اور ہندوستان دو ٹکڑے ہو کر ہی سہی آزاد ہوا اور آزادی کے بعد نصف صدی سے اپنی تعمیر اور ترقی میں منہمک ہے۔ رفعت سروش نے اس صدی کے پورے سیاسی منظر نامے کو نہایت کامیابی کے ساتھ منظوم و منجھے ڈرامہ کی شکل میں پیش کیا ہے۔ اس ڈرامے کا بنیادی کردار انسان ہے جو اپنا تعارف یوں کراتا ہے:

میں ایک انسان ایک صدی ہوں
گزرتے لمحوں کو میں نے اوراقِ ذہن پر
——اس طرح لکھا ہے
کہ ایک اک لفظ سانحہ ہے
کہ ایک اک لفظ تجربہ ہے
مرے لہو میں ہے آگ روشن
مرے نفس کے یہ زیر و بم انقلابات
——کے امیں ہیں
کتاب ہے زندگی کی میری کشادہ سینہ
مجھے وہ لمحہ ہے یاد جس دم
افق سے ابھرا تھا آفتاب اک نئی صدی کا

اس صدی کے شروع میں اقبال نے اپنا مشہور ترانہ لکھا ہے: "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا"۔

اس ڈرامے میں بتدریج آزادی کی منزلیں مختلف منازل کے ساتھ پیش کی گئی ہیں۔ تقسیم بنگال، بدیسی مال کا بائیکاٹ، ہندو مسلمانوں کے الگ الگ دوست ماں کے علاوہ کلکتہ سے انگریزوں کی دارالحکومت کا دلی منتقل ہونا، پھر انگریزی مظالم کا حد سے گزر جانا، فرقہ وارانہ فسادات، جلیانوالہ باغ کا قتل عام اور دیگر وہ اقدامات جو وقت وقت پر انگریزوں نے ہندوستان کی تحریک آزادی کو کچلنے کے لیے کیے، اس ڈرامے میں نہایت پُراثر انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ ملک کی تقسیم اور ہندو مسلمانوں کے خون سے لت پت آزادی کو بھی موثر ڈھنگ سے پیش کیا گیا ہے۔ آزادی کے بعد تعمیری سرگرمیوں کا ذکر کرتے وقت انسان جو اس ڈرامے میں مورخ کا کردار ادا کر رہا ہے دکھ بھرے انداز میں تبصرہ کرتا ہے:

جو مری آنکھوں نے دیکھا کاش پر سکتا
——وہ سب
جتنے گاندھی تھے سیاست میں انھیں دار کیا
جتنی سچائی کا حل جل کر گھٹ گیا
اور فسادوں کا ابھی تک چل رہا ہے سلسلہ
بے گناہوں کے لہو سے تر ہے دامن
ارضِ ہندوستان کا

لیکن وہ مستقبل سے مایوس نہیں ہے۔ صدی کے اختتام پر کہتا ہے:

میں تو رخصت ہو چلا ہوں نوجوانوں کو سلام
ملک کو آگے بڑھانا عمل میں ہے ان کا کام
اور ڈرامہ ایک بھرپور کورس پر ختم ہوتا ہے جس میں نوجوانوں کا نیا عزم ہے:
ہم ہیں آتو دوس کی عظمتوں کے پاسدار
جب ملیں گے سب گئے اقبال کو قرار

مجموعی طور پر یہ ڈرامہ ہندوستان کی عظمت، آزادی کی جدوجہد اور آزادی کے بعد کے حقائق کو پیش کرتا ہے اور اس تصور کو ابھار کرتا ہے کہ قومی یک جہتی اور بین المذاہب اتحاد میں ہی ہندوستان کا مستقبل پوشیدہ ہے۔ اکیسویں صدی میں قدم رکھتے وقت ان حقائق کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔

یہ ڈرامہ شگفتہ اور آسان زبان میں لکھا گیا ہے۔ ضرورت کے مطابق اشعار میں مکالموں کا اندراج ہے۔ ۴۸ صفحات پر مشتمل اس کتاب کی قیمت ۲۵ روپے نہایت مناسب ہے۔ کتاب بیچ بیک پر چھپی ہے۔ رفعت سروش نے اس ڈرامے کو تعلیمی اداروں کو پیش کرنے کی اجازت بھی درج کر دی ہے۔ یہ ایک مستحسن عمل ہے۔

☆☆☆☆☆

نام کتاب : بابِ سخن
مصنف : محسن زیدی
ضخامت : ۱۳۳ صفحات
قیمت : ۱۰۰ روپے
تقسیم کار : موڈرن پبلشنگ ہاؤس، گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
تبصرہ نگار : رام پرکاش راہی

اس سال یعنی ۲۰۰۰ء میں شائع ہونے والی زیرِ نظر تصنیف محسن زیدی کے چالیس سال سے بھی زیادہ تخلیقی سفر کا چوتھا سنگِ میل ہے۔ موصوف کا ۱۹۶۱ء میں کتابی صورت میں پہلی بار منظرِ عام پر آنا اگر پیش نظر رہے تو ان کے یہاں قادر الکلامی ایک مستند اور مستقل صورت حال کے خد و خال اختیار کر جاتی ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ محسن کا تخلیقی میدان غزل اور صرف غزل کی جولان گاہ رہا ہے تو لازمی طور سے ان کے یہاں فکری صلابت اور فنی استقامت اپنے رنگ و آہنگ کی بدولت جذب و اثر کا جادو جگائے بغیر نہیں رہ سکتے۔

موصوف کے حصے میں آئی شعر کہنے کی خداداد صلاحیت جن خیالی عناصر اور واقعاتی حقائق کے پنگھوڑے میں پروان چڑھی ہے وہ اپنی اپنی انفرادیت کے حامل ہیں۔ سید زادہ ہونے کی سعادت، غیر معمولی تعلیم و تربیت، معاشی زندگی میں ایک طرح کی خود کفالت اور ان سب پہلوؤں سے وابستہ مشاہدات اور تجربات کی وسعت ان کے ذوقِ شعر گوئی کے لیے نہ صرف باعثِ تحریک ثابت ہوئی بلکہ اسے فکری اور فنی تاب و تواں بھی عطا کی۔ ان کے تخلیقی مزاج میں پہلی چیز جو کار فرما ہے وہ ہے ان کی بے لاگ ہندوستانیت اور سچا احساسِ وطنیت جس کے بڑے ہی معصوم و معقول اظہار نے ان سے ایک بڑی خوب صورت غزل کہلوائی جس کے کچھ اشعار حسبِ ذیل ہیں۔

کیوں ہم سے پوچھتے ہو کہ ساکن کہاں کے ہیں
ہندوستان میں رہتے ہیں ہندوستاں کے ہیں

اس خاک سے اٹھا ہے ہمارا خمیر بھی
تم ہو اگر یہاں کے تو ہم بھی یہاں کے ہیں

میراث مشترک ہے تو ہم بھی ہیں اس میں ورثہ دار
چشم و چراغ ہم بھی اسی خانداں کے ہیں

محسن بھٹکا رہے گا اسی آستاں پہ سر
سجدہ گزار ہم تو اسی آستاں کے ہیں

انگریزی کے معروف انشائیہ نگار LEIGH HUNT کے الفاظ میں:
Years have brought the philosophic mind یعنی عمر

رسیدگی فلسفیانہ سوچ کو راہ دیتی ہے۔ چنانچہ محسن کے جمالیاتی شعور اور اسی کے توسط سے موصوف کے رومانی احساس اور جذبے کا معیار جانا ایک حقیقت ناگزیر تھا۔ اسی لیے 'باب سخن' کے بیش السطور مشمولات کے مطابق اپنی تخلیقی تمنا کے اگلے قدم کی صورت میں جہاں بھی اس نے عشقیہ شعر کہنے کی کوشش کی ہے ایک مجازی صورت اختیار کہیں کہیں عشق حقیقی کی سی تشنگی اختیار کر گئی ہے۔ ذیل کے اشعار اس نقطہ نگاہ سے قابل غور ہیں۔

آنکھوں میں بس گئی ہے وہ تصویر اس طرح
میری نگاہِ شوق بھی تصویر ہو نہ جائے

اک بار پھر ہے تغیر سرا میرا ساز دل
اک جنبشِ نگاہ کی مضراب سے ہوا

میں بے شعور ہوا ورنہ کس شمار میں تھا
یہ معجزہ بھی اسی اسم کے عدد سے ہوا

وا ہے میرے لیے جس کی خاکِ پا محسن
اسی کا اسم ہے حرفِ دعا بھی میرے لیے

تا عمر جو مخالف رہی ہو ستش کی
گمراہ مرے گیا اس کی بندگی کا خیال

اک ترے ہونے پہ موقوف ہے سب کچھ ورنہ
یہ مری حسنِ نظر حسن یقیں کچھ بھی نہیں

"باب سخن" کی غزلوں میں ایک شوخ و شنگ اور گدگدی فضا جو زیادہ تر ایک غالب صورتِ حال کی طرح چھائی ہوئی ہے وہ محسن کے فنی، فکری اور فنی تشخص سے مرتب ہوئی ہے۔ اس تشخص کے چند پہلو ہیں: اس کا کسی حد تک حسینی مزاج، تلخ حقائق کی ناگزیریت کا احساس، معاملہ حسن و عشق کا نفسیاتی ادراک، زندگی کے اندھیروں میں روشنی کے نشانوں کی تلاش، عصری فضاؤں میں نام نہاد تصنع کا تنقیدی وجدان اور خودی اور حمیت کا شعور۔ ذیل کے اشعار اس حقیقت کے اثبات میں نذرِ قار کیے گئے ہیں۔

کتنا آب جو کسی کی پیاس پہ آئی
تو پھر رہا نہ ہمیں اپنی تشنگی کا خیال

اس دھوپ میں سفر کا اگر قصد ہے تو پھر
گھر پہ خیالِ سایۂ دیوار رکھ کے آ

شکستِ خواب کا عالم نہ پوچھ
بڑی کڑوی حقیقت سامنے تھی

وہ واپس لے رہا ہے قرض اپنا
ہمارے پاس سے کیا جا رہا ہے

کوئی دیوار نہ در جانتے ہیں
ہم اسی دشت کو گھر جانتے ہیں

قطرہ ان کا آب ہوا تو ہے مگر کچھ اس طرح
جیسے صحرا سے گزر جائے کوئی جو رواں

روح رواں کے بھی مرے لب
کوئی شکوہ نہ گلا سب خاموش

رات کالے نہیں کٹتی ہے مگر
رات بے تاب سحر جانتے ہیں

انقلابات کی تعبیر میں کیا رکھا ہے
ہم نے دیکھا ہے بدلتا ہے زمانہ کیسے

سجی ہیں چہروں پہ جیسے شگفتہ ہونے
جسے فروغ یہ اب رسم رونمائی ہے

نہاں سارا اسی چہرے سے عیاں تھا
دلوں کی سب کدورت سامنے تھی

آ تھ اب نہ پوچھا گیا ہے مجھے مطلوب
یہ ہاتھ نہیں کوئی مرا دستِ گدا ہوں

ثبوت اپنا دیا خود تو اعتبار ملا
میں معتقد کسی غیر کی سند سے ہوا

زبان و بیان کی لکھنوی فصاحت میں رچی بسی یہ غزلیں ان تند و تلخ واقعاتی حقیقتوں کی ترجمانی کرتی ہیں جو ایک خدا داد ہمواریت سے تنگی دگی زندگی کی بہتی ندی میں وقتاً فوقتاً چھوٹی بڑی لہروں کی طرح سر اٹھاتی ہیں اور محسن جیسے حساس اور نرم مزاج شاعر کے ذوقِ نظارگی کو تصویر و تصور کی تخلیقیت کا اعجاز فراہم کرتی ہیں۔

یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ کتاب کی تمام تر بیرونی اور اندرونی جمالیاتی خوبیوں کی آغوش میں تغزل اور شعریت کی مہک اس کے لیے دعوتِ مطالعہ کا اعلان بن گئی ہے۔ ◻◻

بقیہ صفحہ ۲ سے آگے

بقیہ صفحہ ۲ سے آگے

سردار محمدی بیگم اردو کے ساتھ گوگی بھی روانی کے ساتھ بولتی تھیں۔ آزادی (۱۹۴۷ء) کے بعد انھیں فالج ہوا اور پونے ہی میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کے شوہر مولوی غلام محمد جیلانی کا انتقال سردار محمدی بیگم کے انتقال کے بعد ہوا۔ دونوں پونے ہی میں مدفون ہیں۔

سردار محمدی بیگم کا تعلق مہاراشٹر میں ساتارا کے قریب چھوٹی سی ریاست "وائی" (WAI) سے تھا۔ اس ریاست کے بارے میں فی الوقت میری معلومات کم ہیں۔ سردار غلام جیلانی بجلی خاں اس ریاست کے غالباً آخری نواب تھے جو ۲۸ جولائی ۱۸۸۸ء میں پیدا ہوئے۔ راجکوٹ کے مشہور راجکمار کالج میں تعلیم حاصل کی۔ ان کی شادی یہیں قریب ریاست جاورہ کے نواب کی بہن سے ہوئی (۱۹۰۹ء) پھر امپیریل کیڈٹ کور میں ۱۹۰۶ء، ۱۹۰۸ء خدمات

انجام دیں۔ یہ بمبئی کی لیجسلیٹو اسمبلی اور لیجسلیٹو کاؤنسل کے ۱۹۲۱ء تا ۱۹۲۳ء ممبر تھے۔ پھر بمبئی پریسڈنسی مسلم لیگ کے نائب صدر منتخب ہوئے۔ وہ ساتارا ضلع کی انجمن اسلام کے بھی صدر مقرر ہوئے اور بمبئی کے گورنر کے (۱۹۲۹ء میں) اعزازی اے۔ ڈی۔ سی رہے اور اسٹیٹ کاؤنسل جاورہ کے ۳۰ر جولائی ۱۹۳۰ء میں (تین ماہ کے لیے) صدر مقرر ہوئے۔ یہ وائی کے محل (The Palace, WAI) میں قیام کرتے تھے۔ سردار محمدی بیگم اُن کی بیٹی تھیں جو اس خاندان کا روشن چراغ تھیں جنھوں نے تعلیم نسواں کے لیے اپنی مقدور بھر کوشش کی۔

اردو زبان و ادب کے خدمت گزاروں میں معروف اور غیر معروف ہزاروں نام شامل ہیں جنھوں نے تحریر، تقریر اور تعلیم کے ذریعے زبان و ادب کو توانائی بخشی۔ ان میں سے صرف منتخب نام جنھوں نے اپنی تصانیف یادگار چھوڑی ہیں ہماری تاریخ زبان و ادب کا حصہ ہیں۔ لیکن ایسے بے شمار لوگ ہیں جنھوں نے تصنیف و تالیف کا کام نہیں کیا اور صرف درس و تدریس سے وابستہ رہے۔ ان کی خدمات کا اعتراف بھی ضروری ہے۔ اردو زبان و ادب کے معماروں میں ان کی حیثیت بنیاد کے پتھروں کی سی ہے جن پر یہ عظیم الشان عمارت تعمیر ہوئی ہے اور انھی کی وجہ سے آج اردو زبان و ادب کو قاری نصیب ہیں۔ تہذیب اور لسانی ثقافت کی محافظ مردوں سے زیادہ خواتین ہوا کرتی ہیں۔ اردو تہذیب کی نگہداشت اور اس کی اشاعت میں خواتین نے ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ ان کی تصانیف اور تالیفات نہیں ہیں (سوائے چند کے) لیکن ان کی ان خاموش خدمات کا جو انھوں نے اپنے عہد کے تعلیمی و تہذیبی رسالوں میں مضامین لکھ کر کیں، انھیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اردو کی ایسی خاموش خدمت گزار خواتین کا ذکر جنھوں نے مولوی ممتاز علی اور محمدی بیگم کے مشہور زنانہ رسالہ "تہذیب نسواں" اور دیگر رسالوں کے ذریعے کی ہے اس کا عالمانہ مطالعہ گیل منالٹ (Gail Minault) نے اپنی کتاب Secluded Scholars میں کیا ہے۔ سردار محمدی بیگم کوکن کی ایک حوصلہ مند خاتون تھیں جنھیں اردو زبان، اردو تہذیب اور تعلیم نسواں سے خصوصی دل چسپی تھی جنھوں نے ۱۹۲۷ء تک "تہذیب نسواں" میں چھوٹے چھوٹے مضامین لکھ کر اور طالبات کو اردو کی تعلیم دے کر اردو زبان کی خدمت کی ہے اور کوکن اور پونے کی خواتین میں اردو زبان و ادب سے دل چسپی پیدا کر کے ان کے ذہنوں کی تربیت کی ہے۔ ایسی کتنی ہی خواتین ہوں گی جنھوں نے بیگم ہمایوں مرزا، محترمہ نذر الباقر، محمدی بیگم، عطیہ بیگم فیضی اور زہرا بیگم فیضی کی طرح اردو زبان و ادب کی خدمت کی ہوں گی جن کے نام ابھی عزلت نشینی و گمنامی کے پردے میں ہیں اور جنھیں دوسری گیل منالٹ (Gail Minault) کی تلاش ہے۔ ایسی ہی خواتین میں سردار محمدی بیگم کا بھی نام ہے۔

حواشی:

1. تفصیلات کے لیے دیکھیے: بمبئی میں اردو (۱۹۸۴ء) تک از ڈاکٹر میمونہ دلوی۔
2. امکان (مجلہ مہاراشٹر اردو اکادمی) ۱۹۸۵ء، مضمون "کوکن کے لوک گیت" از ڈاکٹر میمونہ دلوی۔
3. سردار محمدی بیگم کے حالات زندگی کے لیے میں محترمہ حشمت سراج الدین (عمر تقریباً ۸۰ سال) کا شکر گزار ہوں جو نہ صرف سردار محمدی بیگم کی عزیزہ (بھانجی) ہیں بلکہ جنھوں نے ان کی نگرانی میں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ اسی طرح میں اپنے دوست ڈاکٹر عبدالقدوس شیخ، سابق پرنسپل مہاراشٹر کالج کا بھی شکر گزار ہوں جن کے توسط سے مجھے ان کی خوش دامن صاحبہ، محترمہ حشمت بیگم سے نہ صرف تعارف حاصل ہوا بلکہ جنھوں نے اپنی یادداشت سے سردار محمدی بیگم کے حالات بیان کیے۔ سردار محمدی بیگم کے سلسلے میں چند باتیں میرے خالہ زاد بھائی ابراہیم عبدالرحیم دلوی سے بھی معلوم ہوئیں جو قاضی سعد اللہ وکیل تھانہ کے نہ صرف قریب تھے بلکہ جن کی ان سے رشتہ داری بھی ہے اور جنھوں نے سردار محمدی بیگم کو دیکھا ہے۔

4- India's Who's Who (1937-38) Editor Wawan P. Kabadi (1937).
5- GAIL MINAULT: Secluded Scholars. Oxford University Press (1998).

بقیہ صفحہ ۸ سے آگے

اشاریت اور رمز داری۔ ساتھ ہی ڈرامائی انداز صرف انھی کا حصہ ہے جب کہ راسخ نے اسی بنیادی خیال کو وضاحت اور مدلل انداز سے پیش کیا ہے۔

راسخ کے کلام میں شاعرانہ اور فنکارانہ خوبیوں کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت کا پرتو ہے۔ ایسا نہیں کہ ان کا تمام کلام صرف قدما کے نظریات کی بازگشت ہے۔ مثلاً

(۱)
کیا ضرورت ہے کہ بیٹھیں صحبتِ ناجنس میں
ہم سخن کوئی نہ ہو ہم داستاں کوئی نہ ہو

(۲)
زمیں کا رہنے والا ہوں فلک سے ہے مرا کیا رشتہ
زمیں میری مخالف ہو، ستمگر آسماں کیوں ہو

(۳)
کبھی فرعون کی چوکھٹ پہ میں سجدہ نہیں کرتا
خدا جب مہرباں مجھ پہ ہے دنیا مہرباں کیوں ہو

(۴)
میں اگر آزاد ہو کر کھول دوں تیرے قریب
پھر اسیر حلقۂ زلفِ بتاں کوئی نہ ہو

اگرچہ مندرجہ بالا اشعار غزل کے اشعار ہیں لیکن غزل کے مخصوص مزاج کو دھیان میں رکھتے ہوئے ان کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تو اس دور کے سیاسی اور سماجی پس منظر کو بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ شعوری کوشش نہ ہو لیکن شعر نمبر ۴ جس غزل سے حاصل کیا گیا ہے اس کے کچھ اور اشعار اس خیال کو تقویت دیتے ہیں۔ مثلاً

شام ہوتے ہی بسیرا ہو درختوں کے تلے
ایسی دنیا ہو آشوبِ جہاں کوئی نہ ہو
سایۂ دیوار ہو پشت و پناہ بے کسی
دشتِ غربت کے سوا دارالاماں کوئی نہ ہو

آشوبِ جہاں کا احساس اور اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے دشتِ غربت میں پناہ آوری کے بجائے ویرانے کی تلاش راسخ کے لاشعور میں چھپی ہوئی بے چینی اور ماحول کی تبدیلی کی خواہش کو ضرور نمایاں کرتے ہیں۔

راسخ کی غیور فطرت نے ان سے ایک بڑا ہی پُر لطف شعر کہلوایا ہے:

دعائیں خود بخود مقبول ہو جاتی ہیں گھر بیٹھے
ہمیں فرصت کہاں یارب حیات کھٹکھٹانے کی

اس شعر میں بے نیازی، شوخی، سنجیدہ ظرافت کی بڑی خوب صورت مثال ہے۔ خودداری کی مثال میں ایک دوسرا شعر بھی اہم ہے لیکن اس میں تلخی سی آگئی ہے:

جہاں بھر کا ہے دامن کون کس کا کس کو فرصت ہے
ذلیل و خوار ہو کر ہاتھ پھیلایا کرے کوئی

منتخب اشعار میں بڑی برجستگی ہے اور محاورے کا خاص لطف بھی:

نہیں ہم بچے تھے اس رنگ کی لت تھی
جوانی میں ہو گئی کبھی میں پھسلنے لگے

بہت پُر لطف شعر ہے۔ ایک ہی مصرعے میں دو محاورے کیا خوب نظم ہوئے ہیں۔ سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ کہیں آورد کا شائبہ نہیں۔ مختصر طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اشعار کی ظاہری خوب صورتی، زبان کی شائستگی، محاورے کا استعمال اور قدما کی پیروی محترم راسخ کا خاص رنگ ہے۔ جو اشعار میرے سامنے ہیں ان میں سوز و گداز اور داخلیت نہیں ہے لیکن سارے کلام کو پڑھے بغیر یہ رائے ضروری نہیں کہ صحیح ہو۔ تشبیہ، استعارہ اور زندگی کے حقائق بھی کچھ کم اہم نہیں ہیں۔

مختصر طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ راسخ بے شک راجستھان کے اساتذہ میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے شعر و شاعری کو صرف دل لگی کے لیے نہیں بلکہ پوری سنجیدگی سے اپنایا اور بحیثیت فنکار اپنے فن کو بلندیوں پر پہنچانے میں کامیابی کی منزلوں سے ہم کنار ہوئے۔ ان کی زبان کی پختگی دہلی اور لکھنؤ دونوں اسکولوں کی ٹکسالی زبان کا خوب صورت سنگم ہے اور ان کا کلام بھی رطب و یابس سے پاک ہے۔ ہمیں امید ہے کہ جب ان کا پورا کلام شائع ہوگا تو اس سے اہلِ ذوق اور بھی فیض یاب ہوں گے ساتھ ہی علم و فن کے کچھ نئے باب بھی وا ہوں گے اور دامنِ اردو کی وسعتوں میں اضافہ ہوگا۔ محترمہ راسخ بیکانیری کی غزلیات میں زبان کی پختگی بہت نمایاں ہے جو کہ تمام بزرگ شاعروں کا مشترکہ ورثہ ہے جسے آج کل نہایت بے دردی سے برباد کیا جا رہا ہے۔ کلامِ راسخ سرکار شائع ہو رہا ہے یہ بہت خوشی کی بات ہے۔ خداوند عالم کامیابی عطا فرمائے۔ □□

راسخ بیکانیری

ڈاکٹر روشن اختر کاظمی
صدر شعبۂ اردو و فارسی
راجستھان یونیورسٹی، جے پور

بیکانیر راجستھان کی ان خوش قسمت ریاستوں میں سے ایک ہے جہاں قیام راجستھان سے قبل بھی اردو شعر وادب کا بول بالا تھا۔ صرف اتنا ہی نہیں یہاں ۱۹۱۲ء تک اردو سرکاری زبان بھی رہی۔

یوں تو اردو زبان کی نشو ونما کا سلسلہ ۱۸۵۰ء سے قبل بھی یہاں جاری تھا لیکن اس کے بعد اس عمل کی رفتار تیز ہو گئی۔ یہ دوسرا موضوع ہے اس لیے سردست یہاں باہر سے آنے والے صرف ایک بزرگ شاعر کا نام لینا چاہوں گی جنھوں نے بیکانیر کو عرصے تک اپنے فیض سے مالا مال کیا۔ یہ بزرگ حضرت رعنا لکھنوی تھے۔ اگرچہ رعنا کے والد ریاست جے پور میں ملازم تھے لیکن رعنا کو ملازمت ہی کے سلسلے میں بیکانیر طلب کیا گیا اور پھر وہ وہیں کے ہو گئے۔

یوں کہ وہ فطرتاً شاعر تھے اور پھر درس و تدریس ان کا ذریعہ معاش تھا اس لیے انھوں نے وہاں باشعور اور تعلیم یافتہ طبقے کو متاثر کیا اور بیکانیر میں شعر وادب کا بول بالا ہو گیا۔

راسخ بیکانیری اسی سلسلے کی ایک کڑی ہیں جو بیکانیر کے شعرا میں امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ راسخ کے والد ماجد حاجی محمد عبداللہ بیدل بھی شاعر تھے، اس طرح راسخ کو اپنے گھریلو ماحول سے بالک یہ کہا جائے کہ ورثے میں شاعری ملی تھی تو غلط نہ ہوگا۔ بچپن سے ہی انھوں نے موزونیت طبع کے جوہر دکھانے شروع کر دیے تھے۔ یہ دیکھتے ہوئے ان کے والد نے انھیں بیخود دہلوی کا باقاعدہ شاگرد بنا دیا۔

محمد ابراہیم غازی کا بیان ہے کہ بیخود نے بہت جلد راسخ کے کلام کو اصلاح سے مستثنیٰ کر دیا اور ساتھ ہی "فنا فی الشعر" کے خطاب سے بھی نوازا۔ راسخ کی مشق سخن جاری رہی۔ یہ اگرچہ ان کی معاشی زندگی کا مصروف ترین دور تھا لیکن آپ کی شاعری میں سست رفتاری نہیں آئی۔ یہاں تک کہ جب آپ ۱۹۳۵ء میں "سادول ہائی اسکول" میں شعبہ اردو و فارسی میں سیکنڈ مولوی کے عہدے پر فائز ہوئے تو آپ کی زندگی میں ایک اور درخشاں باب کا اضافہ ہوا۔ یہاں آپ حضرت بادشاہ حسین رعنا سے مستفید ہوئے جو ہیڈ مولوی تھے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ راسخ بیکانیری کو پہلے گھر سے علمی و ادبی ماحول ملا پھر بیخود جیسے استاد کی شاگردی اور رعنا کی صحبت نصیب ہوئی اس طرح وہ تمام ذرائع جو شخصیت کی تشکیل کا ذریعہ ہوتے ہیں انھیں حاصل تھے۔ ان کا فن روز بروز نکھرتا گیا۔ یہاں ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ اس قسم کے مواقع دوسرے لوگوں کو بھی حاصل ہوتے ہیں لیکن وہ اس طرح زندگی بسر کرتے ہیں کہ ان کے بعد صرف ان کے افراد خاندان ہی انھیں یاد رکھتے ہیں اور یہ سلسلہ بھی زیادہ سے زیادہ دو پشت چلتا ہے۔ آج زیادہ تر لوگوں کو اپنے دادا پانا سے آگے کے بزرگوں کے نام تک یاد نہیں اس بات کا چھوٹا سا ثبوت یہی ہے۔

ہمیں بیخود دہلوی اور رعنا کی فیوض وبرکات تسلیم ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ قبولیت کا مادہ یقیناً راسخ کی فطرت میں موجود تھا اسی طرح جس طرح ساز خاموش میں نغمے اس وقت تک خوابیدہ رہتے ہیں جب تک کہ وہ تشنۂ مضراب رہتا ہے اور مضراب پر چوٹ پڑتے ہی وہ نغمے بیقرار ہو کر ہواؤں کے دوش پر فضاؤں میں پھیل جاتے ہیں اور کتنے ہی دل انھیں سن کر ایک روحانی سرشاری میں ڈوب جاتے ہیں، بالکل اسی طرح کچھ شخصیتیں ساز کی طرح ہوتی ہیں اور کچھ مضراب نما، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ راسخ کی زندگی میں اساتذۂ فن سے قربت ان کے پوشیدہ جوہروں کو نمایاں کرنے میں معاون ثابت ہوئی اور انھوں نے شعر و شاعری کی دنیا میں ایک ایسا چراغ روشن کیا جو آج بھی نہ صرف بیکانیر بلکہ دور دور تک اردو کی محفلوں میں اپنی روشنی بکھیر رہا ہے۔ راسخ نے غزل گوئی پر خاص توجہ دی کیوں کہ اس سے انھیں فطری وابستگی تھی۔ انھوں نے غزل کے مروجہ مضامین ہی کو برتا ہے عام طور سے یہی نظر آتا ہے لیکن چوں کہ ان کا تمام کلام ابھی شائع نہیں ہوا ہے اس لیے حتمی طور پر کوئی رائے دینا ممکن نہیں۔ میرے سامنے ان کا مجموعہ "صحیفۂ راسخ در زمین غالب" موجود ہے جس کی روشنی میں میری نظر میں وہ ایک پختہ کار شاعر ہیں، خاص طور سے زبان کے سلسلے میں انھوں نے لسانی اصول و ضوابط کا پورا پورا لحاظ رکھا ہے۔ ان کی زبان بلاشبہ اساتذۂ فن سے ٹکراتی ہے۔ کوئی بھی نامانوس لفظ یا ترکیب اس مجموعے میں مجھے نظر نہیں آئے۔ غزلیں اپنے ظاہری حسن میں دل فریب ہیں اور زیادہ تر طویل ہیں غالباً یہ لکھنوی اسکول کا اثر ہے کیوں کہ وہاں طویل غزلوں کا کہنا قابل فخر سمجھا جاتا تھا۔

راسخ نے مختلف اساتذہ سے کسب فن کیا ہے۔ ان کا یہ شغف ان اشعار میں نمایاں ہے جو غالب کے اشعار کی معنوی اعتبار کی یاد دلاتے ہیں:

غالب:

جراحت تحفہ، الماس ارمغاں، داغ جگر ہدیہ
مبارک باد اسد غم خوار جان درد مند آیا

راسخ:

ہے کم غم ہے درد ہے حسرت ہے یاس ہے
اللہ کا کرم ہے یہاں کیا نہیں رہا؟

دونوں اشعار میں معنی کے لحاظ سے بہت فرق نہیں لیکن طرز ادا میں بہت واضح فرق ہے۔ غالب نے ایمائی لحاظ سے محبوب کے عطا کردہ زخموں کا بیان کیا ہے ساتھ ہی لفظ "مبارک باد اسد" "غم خوار جان درد مند" کے الفاظ سے طنز کا جو پہلو پیدا کیا ہے وہ اردو غزل کے محبوب کی تصویر مکمل طور سے پیش کرنے کے لیے کافی ہے۔ راسخ کا اشارہ بھی محبوب ہی کی طرف ہے لیکن اللہ کے کرم کا تذکرہ درمیان کی کئی منزلوں کو طے کرنے کے بعد ہی پیدا ہو سکتا ہے۔ مطلب یہی ہے کہ میرے محبوب نے غم و درد، حسرت و یاس کی کیفیت میں مبتلا کیا ہے پھر بھی میں اسے اللہ کا کرم سمجھتا ہوں اور محبوب سے کوئی شکوہ نہیں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ غالب کا محبوب مجازی ہے لیکن راسخ کے اس شعر میں عشق حقیقی کی جھلک دیکھ لینا مشکل نہیں ہے۔ غالب نے ایک کیفیت کو پیش کیا ہے لیکن راسخ آلام و حوادث میں ایک باحوصلہ اور راضی برضائے الٰہی انسان کے طرز فکر کو پیش کرتے ہیں۔ غالب کے شعر میں جذب کی گہری آنچ محسوس کی جا سکتی ہے لیکن راسخ کے یہاں یہ جذبہ سرد ہو چکا ہے۔

غالب کے ایک اور مشہور شعر کے مرکزی خیال کو راسخ نے اس طرح پیش کیا ہے:

غالب:

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا؟

راسخ:

انسان پکڑا جائے یہ کیسی گرفت ہے
لکھے سے اگر گناہ فرشتے لکھے بغیر

دونوں اشعار کا مرکزی خیال اگرچہ ایک ہی ہے لیکن دونوں میں بڑا نمایاں فرق ہے۔ غالب نے ایک عقیدے کو بیان کیا ہے۔ ہمارے اعمال لکھنے والا چوں کہ انسان نہیں فرشتہ ہے اس لیے ہمیں یہ شک ہے کہ اس نے جو کچھ لکھا ہے وہ ہمارے حق میں نہیں ہے اور ساتھ ہی یہ خواہش بھی ظاہر کی ہے کہ جزا و سزا کا رجسٹر مرتب کرتے وقت انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ کوئی ہمارا معتبر آدمی بھی موجود ہوتا۔ غالب نے کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے بلکہ دوسرے مصرعے میں صرف ایک خواہش بیان کی ہے (آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا) بڑی ہی معصومیت ہے اس انداز بیان میں۔ پہلے مصرعے میں بھی تکنیک کا پہلو ہے، یعنی ہمیں کیا پتا کہ ہم کس جرم میں پکڑے گئے ہیں کیوں کہ جو منصف ہے اسی کے مقرر کردہ فرشتے ہماری فرد حساب تیار کرتے ہیں۔ اگرچہ گستاخی ہے لیکن اس شعر کے ساتھ ہی یہ خیال تو ضرور آتا ہے کہ انصاف کا تقاضا تو وہی ہے جو غالب چاہتے ہیں۔ راسخ نے اسی خیال کو زیادہ واضح کر دیا ہے۔ یہاں غالب والی اشارت نہیں ہے اور نہ ادا بلکہ بات کو سیدھے سادے انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ بہرحال راسخ کا شعر بھی لطف سے خالی نہیں ہے۔

میں زیادہ اشعار کی مثالیں نہ دوں گی کیوں کہ ڈاکٹر فیروز احمد اس سلسلے میں مجھ سے قبل بہت سی مثالیں پیش کر چکے ہیں۔ مجھے صرف اتنا کہنا ہے کہ غالب کے اشعار میں ایمائیت،

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

ایڈیٹر: خلیق انجم
پرنٹر، پبلشر: شاہد خاں　مطبوعہ: شمر آفسٹ پرنٹنگ پریس، نئی دہلی
مالک: انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر ۲۱۲، راؤز ایونیو، نئی دہلی ۲
قیمت فی شمارہ: ڈیڑھ روپیہ　سالانہ: ۷۰ روپے (بیرونی ممالک: ۸ امریکن ڈالر)
Phones: 3237210,3236299 Fax: 011-3239547